ترکی میں احیائے اسلام کی تحریکیں: ایک مطالعہ

A Study of Islamic Revival Movements in Turkey

*ڈاکٹر ذاکرہ پروین

Abstract

A number of protestant Islamic movements had been prompting in various eras of the history of Islam. Several religious and ameliorative movements started specifically in Iran, Egypt, Syria, Lebanon, North Africa, Afghanistan, Turkey and India during the midst of thirteenth century A.H. These movements arose after centuries of passivity. They were, to some extent contrary to the political, economic, cultural and colonial policies of West while in the Islamic world considered as efforts of Islamic reforms and re-advancement of Ummah. Many of these movements also provoked in Turkey for the establishment of Islamic ideology. Some of them are as under: "Pan Islamism" movement of Syed Jamal-u- Din Afghani Movement against inspiration of West Struggle of Midhat Pasha and Mustafa Fazil Pasha. Struggle of Islamists Milli-gorush movement and Najm-u- Din Arbakaan Islamization of Recep Tayyip Erdogan.

Keywords: Islamic, Movements, Turkey

عام طور پر علمی وفکری تحریکیں عوامی سطحی پر زیادہ نہیں پھیلتیں بلکہ ان کا ہدف کسی معاشرے کے ذہین ترین افراد (Intelligentsia) ہوتے ہیں۔ یہ معاشرے کا وہ طبقہ ہوتا ہے جو پڑھنے، سوچنے، سمجھنے، لکھنے، پالیسیاں بنانے اور معاشرے کی راہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پہلے زمانوں میں یہ طبقہ بہت محدود تھا تاہم جدید دور میں اس طبقے کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ حکمران، بڑے کاروباری افراد، مذہبی علماء، بیوروکریٹ اور پروفیشنلز جیسے ادیب، شاعر، ڈاکٹرز، صحافی، انجینئرز، اکاؤنٹنٹس وغیرہ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عام لوگوں کو تو فکری تحریکوں کے بارے میں بعض اوقات علم بھی نہیں ہوتا۔

*پی ایچ ڈی اسلامیات، جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد

سید جمال الدین افغانی کی تحریک "پان اسلام ازم"

سید جمال الدین افغانی اسد آبادی ۱۸۳۸ء میں افغانستان کے قصبہ اسد آباد میں ہوئے۔ ۱۸۵۰ء میں اپنے علاقے کے ایک مدرسہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں وہاں سے فارغ ہوئے اور اسی سال وہ ہندوستان تشریف لے آئے اور کلکتہ میں قیام کیا۔ کلکتہ کالج کے پروفیسروں سے انگریزی زبان سیکھی اور ۱۸۵۷ء میں واپس افغانستان چلے گئے۔[1] وہاں انہوں نے "شمس النہار" کے نام سے ایک اصلاحی جریدہ جاری کیا۔ وہ افغانستان کے راہنما شیر علی کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کرتے رہے، اُن کی یہ تحریک کامیاب ہوئی اور شیر علی پوری شان و شوکت کے ساتھ تخت کابل پر براجمان ہوئے اور جمال الدین افغانی اس حکومت کے وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۸۶۹ء میں افغانی کے مخالفین کو غلبہ حاصل ہو گیا اور اُن کے لیے افغانستان میں رہنا ناممکن ہو گیا تو وہ ہندوستان چلے آئے۔ لیکن یہاں دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہندوستان کی استعماری حکومت نے انہیں ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا، چنانچہ وہ مصر چلے گئے۔ مصر میں جامعہ الازہر میں قیام فرمایا پھر وہاں سے ۱۸۷۰ء میں ترکی چلے گئے۔ ترکی میں آپ نے مختلف لیکچرز دیئے، وہاں انہوں نے روایتی تصوف کی تردید میں ایک زور دار مہم چلائی۔ اس پر ترکی کے صوفیاء بالخصوص شیخ الاسلام صوفی حسن فہمی اور صوفی یونس وہبی نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ صوفیوں کی سخت ترین مخالفت کی وجہ سے انہیں ترکی سے نکلنا پڑا۔ ۱۸۷۱ء میں انہوں نے واپس مصر کا رُخ کیا اور ایک مرتبہ پھر جامعہ الازہر میں مقیم ہو گئے، اس مرتبہ وہ اس عظیم درس گاہ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۸۷۹ء میں مصر کی فرنگی حکومت نے آپ کو مصر سے نکال دیا اور آپ ہندوستان چلے آئے۔ ہندوستان کے زمانہ قیام میں انہوں نے مادیت پرستی اور دہریت کے خلاف "الدھریہ" اور نیچریت کے خلاف "ردّ نیچریت" کے نام سے کتابیں تصنیف کیں، نتیجتاً ہندوستان سے بھی رَختِ سفر باندھنا پڑا۔ وہ روس چلے گئے، ہندوستان کے زمانہ قیام کے دوران میں ان کی سر سید احمد خاں کے ساتھ مخاصمت رہی۔ ایک طرف تو وہ دونوں، ایک دوسرے کے مذہبی خیالات سے متفق نہ تھے اور دوسری جانب سیاسی معاملات میں افغانی اور سر سید کے نظریات باہم متصادم تھے۔ سر سید برطانوی حکومت کے خلاف کسی سیاسی جدوجہد کے قائل نہ تھے اور صرف تعلیم پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے جب کہ افغانی "پان اسلام ازم" کے نظریے کے داعی تھے۔ افغانی کے خیال میں مسلمانوں کے زوال سے نکلنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ غیر ملکی حکمرانوں سے نجات حاصل کر کے پوری دنیا میں از سر نو خلافت اسلامی کا اجراء کیا جائے۔

افغانی نے روس میں ایک سال سے زیادہ عرصہ وہاں قیام کیا، وہاں انہوں نے اشتراکیت (Communism) کے خلاف آپ نے جو کچھ فرمایا اُس کا خلاصہ علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں "جمال الدین افغانی کا پیغام حکومت روسیہ کے نام"[2] کے تحت نقل کیا ہے۔ روس سے وہ پھر مادر وطنی افغانستان آئے اور وہاں سے انہوں نے "کابل" کے نام سے ایک مجلہ جاری کیا اور اپنی مشہور کتاب "تتمۃ البیان" کی تشہیر واشاعت کا اہتمام کیا۔ کچھ عرصہ افغانستان میں رہ کر اپنی فکر کا تخم بونے میں صرف کیا اور ایک بار پھر ہندوستان تشریف لے آئے اور یہاں تقریباً دو سال اقامت گزین رہے۔ ہندوستان میں وہ کوچہ بہ کوچہ گھوم پھر کر دانش

---

[1] قاضی محمد عبد الغفار، آثار جمال الدین افغانی (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۸۹ء)، ۸۳۔

[2] علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، جاوید نامہ (لاہور: شیخ مبارک علی تاجران کتب، ۱۹۴۷ء)، ۸۷۔

مند و ذہین افراد تک اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ نیز رسالہ "معلم" حیدر آباد دکن، "دارالسلطنت" کلکتہ، "مشیر قیصر" لکھنؤ، "حبل المتین" کلکتہ اور "اخبار اودھ" میں مضامین و مقالات لکھتے رہے۔ فارسی زبان میں اُن کے مقالات کا پہلا مجموعہ بھی اسی دوران کلکتہ سے شائع ہوا۔[3] برسوں کی تگ و دو کے بعد بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عالم اسلام کی زمین میں تخم ریزی کے بجائے انہیں مغربی ممالک میں قیام کرنا چاہیے اور وہاں عالم اسلام کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے ذہین طلباء تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی سلسلہ میں وہ امریکہ چلے گئے، کچھ عرصہ وہاں اپنی دعوت پیش کرنے کے بعد لندن چلے گئے۔ وہاں سے جرمنی گئے اور بالآخر فرانس میں جاکر مقیم ہوئے۔ یہاں غالباً وہ پانچ سالوں تک مقیم رہے اس دوران میں انہوں نے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک عربی مجلہ جاری کیا۔ اس مجلے کے درج ذیل پانچ بنیادی مقاصد تھے:

۱- عالم اسلام کی سیاسی آزادی
۲- اسلام نظام کے قیام کی دعوت
۳- اسلام علوم کی تشکیل جدید کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا
۴- اسلام کی دعوت کو جدید اسلوب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنا
۵- مسلمانوں کو جدید علوم کی تحصیل کی طرف راغب کرنا

انہی مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام ہی سے ایک جماعت بنائی۔

فرانس میں قیام کے دوران میں آپ نے مشہور فرانسیسی مستشرق "رینان" کی کتاب Islam and Science کے ردّ میں ایک کتاب لکھی۔ جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام کی روح سائنس کے خلاف ہے، اسی نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ثابت کیا کہ اسلام کی روح سائنس کے خلاف نہیں ہے۔[4] بعد ازاں آپ ۱۸۸۹ء میں ایران تشریف لے گئے۔ ایران میں آپ نے اپنا ایک حلقہ بنالیا۔ بعد میں ایران کی انقلابی قیادت کا ایک سلسلہ اسی حلقہ سے جاکر ملتا ہے۔ ان کے مداحوں میں روزافزوں ترقی دیکھ کر شاہِ ایران نے انہیں ایران سے نکال دیا۔ اس پر ایران میں اُن کے ساتھ ہونے والے توہین آمیز سلوک کی بناء پر زبردست ہنگامے پھوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ انہی ہنگاموں میں اُس وقت کے شاہ ایران ناصر الدین قتل ہوئے۔ ایران سے اخراج کے بعد آپ عراق چلے گئے، وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد ۱۸۹۱ء کے اوائل میں لندن چلے گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے وہاں ڈیڑھ برس سے زیادہ قیام کیا۔ لندن سے انہوں نے "ضیاء الخافقین" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا[5]، جس کے بعض اقتباسات بعد میں "المنار" مصر میں بھی شائع ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں انہیں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ آپ یہاں آکر اپنے نظریات کی تبلیغ کریں، ہم آپ کے قیام وطعام کا انتظام بھی کریں گے اور آپ کے لیے وظیفہ بھی مقرر کریں گے۔ سید جمال الدین افغانی نے ترکی کی یہ دعوت قبول کرلی اور ۱۸۹۲ء کے وسط میں ترکی

---

[3] عبد الغفار، آثار جمال الدین افغانی، ۳۱۶، ۳۱۵

[4] عبد الغفار، آثار جمال الدین افغانی ۱۶۰، ۱۵۹

[5] عبد الغفار،، آثار جمال الدین افغانی ۳۱۵

آ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ خلیفہ عبد الحمید ثانی اپنی خلافت کے لیے افغانی سے حقیقی اسلامی خلافت کی سند حاصل کر کے پورے عالم اسلام کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں تا کہ ممکنہ برطانوی حملہ کا سدّباب کیا جاسکے۔ جمال الدین افغانی نے اس سے انکار کر دیا۔ جس پر سلطان نے غصہ میں آ کر نہ صرف یہ کہ اُن کا سرکاری وظیفہ بند کر دیا بلکہ انہیں جیل میں بھی ڈال دیا۔ سنہ ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک تقریباً پانچ سال وہ قید میں رہے۔ نظر بندی کے دوران میں بھی اُن کی انقلابی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں جن کی وجہ سے سلطان کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں اس کا حشر بھی ایرانی شاہ ناصر الدین جیسا نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اسی خوف سے سلطان نے انہیں زہر دلوا دیا جس کی وجہ سے وہ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔[6] مولانا ابوالکلام آزاد کی مرحوم سید جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں: "تقریباً دو ماہ گزرے ایک شخص سید جمال الدین نامی سے میری ملاقات ہوئی۔ اس شخص کی شخصیت کا میرے دماغ پر جو اثر پڑا، وہ ایسا ہے جو بہت کم شخصیتیں مجھ پر ڈال سکی ہیں، یہ اثر بہت قوی اور گہرا تھا۔ میں جب اس شخص سے باتیں کر رہا تھا تو اس کے افکار کی آزادی، طبیعت کی فضیلت اور اظہارِ حقیقت کی جرأت دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ میں اس وقت اُن مشاہیر عالم میں سے کسی ایک کو مخاطب کر رہا ہوں جو دنیا کے گزشتہ علمی زمانوں میں گزر چکے ہیں۔ میں گویا ابن سینا، ابن رُشد، یا اُن حکماء عظام میں سے کسی حکیم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جنہوں نے فکر انسانی کو جہل و اوہام کے قیود سے نجات دلانے کے لیے تاریخ عالم کی پانچ صدیوں میں اپنی شجاعانہ جدوجہد جاری رکھی تھی۔"[7]

سید جمال الدین افغانی مغربی و مشرقی علوم پر یکساں عبور رکھنے والے عالم اور مفکر و دانش ور تھے۔ وہ عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فرانسیسی بھی بڑی روانی کے ساتھ بول سکتے تھے۔ مشرقی علوم کی تحصیل انہوں نے افغانستان، ہندوستان، ایران، ترکی، حجاز اور مصر جیسے ممالک میں کی تھی تو جدید مغربی علوم کی پیاس روس، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، فرانس اور امریکہ کے علمی سرچشموں سے بجھائی تھی۔ وہ دنیائے اسلام کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے مغربی اقوام کی سیاسی غلامی کے خلاف باقاعدہ ایک تحریک کا آغاز کیا۔ بعد میں عالم اسلام میں آزادی کی جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں، اُن سب کا سلسلہ انہی کی تحریک "استخلاص دیار المسلمین" سے جا کر ملتا ہے۔ وہ جدید دنیائے اسلام کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ فکر پیش کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے دنیا کے استحصالی نظاموں بالخصوص سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کی زبردست مخالفت کی اور اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنے کے لیے "جمعیت العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ بعد ازاں دنیائے اسلام میں جتنی بھی اصلاحی و احیائی تحریکیں اُٹھیں، اُن سب کا تعلق بھی اسی تحریک سے جا کر ملتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کے ایک مخلص مصلح و مجدد ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "انیسویں صدی کی تاریخ مشرق نے اصلاح و تجدد کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں ان میں کوئی شخصیت بھی وقت کی عام پیداوار سے اس قدر مختلف اور طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوتوں میں غیر معمولی نہیں ہے جس قدر سید جمال الدین کی شخصیت ہے۔ بغیر کسی تامل کے کہا جاسکتا ہے کہ مشرقِ جدید کے رجالِ تاریخ

---

[6] عبد الغفار،، آثار جمال الدین افغانی ۲۹۱، ۲۹۰

[7] ابوالکلام آزاد تاریخی شخصیتیں (لاہور: ابوالکلام اکیڈمی، چٹان پریس، نومبر ۱۹۵۹ء)، ۲۵، ۲۴۔

اور قائدین فکر کی صف میں اُس کی شخصیت کئی اعتبار سے اپنا سہیم وشریک نہیں رکھتی۔"[8] افغانی نے اسلامی قومیت کے نظریہ کو پہلی مرتبہ مدلّل انداز میں پیش کیا۔ تصوف کی شدید مخالفت کی اور وحدت الوجود کے تصور کا ردّ بھی کیا۔ انہوں نے مذہبی وخانقاہی قدامت پسندوں پر بھی زور دار تنقید کی اور سائنسی وبے دین جدت پسندی کی بھی مخالفت کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ کیا اور اُن کی روحانی واخلاقی تربیت پر بھی زور دیا۔ ادب وصحافت کی اصلاح بھی کرنی چاہی اور اسلامی علوم کی تشکیل جدید کی دعوت بھی دی۔

اہل مغرب سے مرعوبیت کو ختم کرنے کی تحریک

سید جمال الدین افغانی کی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے محض فکری نہیں بلکہ سیاسی تحریکوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے تاہم اس سیاسی تحریک کا ایک فکر پہلو بھی تھا جسے ہم یہاں بیان کریں گے۔ جب عالم اسلام، اہل مغرب کے قبضے میں آیا تو مسلمانوں کے اندر ایک قسم کا "احساس کمتری" پیدا ہو چکا تھا۔ جنوبی ایشیا میں سر سید کی تعلیمی تحریک کے نتیجے میں جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی جو نسل تیار ہوئی، وہ مغرب سے پوری طرح مرعوب تھی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماضی پر شرمندہ شرمندہ سے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ مغرب ہر معاملے میں ان سے بہتر ہے۔ معروف یورپی نو مسلم مفکر علامہ محمد اسد (۱۹۹۲-۱۹۰۰ء) اپنی کتاب "Islam At The Crossroad" میں مسلمانوں کی مرعوبیت اور احساس کم تری کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "The tendency to imitate a foreign civilization is invariably the outcome of a feeling of inferiority. This, and nothing else, is the matter with Muslims who imitate Western civilization. They contrast its power and technical skill and brilliant surface with the sad misery of the world of Islam: and they begin to believe that in our time there is no way but the Western way. To blame Islam for our own shortcomings is the fashion of the day. At best, our so-called intellectuals adopt an apologetic attitude and try to convince themselves and others that Islam is compatible with the adoption of Western values." [9]

---

[8] آزاد تاریخی شخصیتیں، ۲۵، ۲۴۔

[9] Muhammad Asad, "Islam At The Crossroad (Gibraltar: Dar al-Andalus,1982), 79.

"کسی غیر ملکی تہذیب کی نقالی، احساس کم تری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ان مسلمانوں کا بھی ہے جو مغربی تہذیب کی نقالی کرتے ہیں وہ اس کی طاقت، فنی استعداد اور ظاہری چمک دمک کا موازنہ عالم اسلام کی پستی سے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں مغربی طرزِ زندگی اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے لیے اسلام کو مطعون کرنا آج کا فیشن بن چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے نام نہاد دانشور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی اقدار کو اختیار کرنے کی راہ میں اسلام مانع نہیں ہے۔"

افغانی کی برپا کردہ فکری تحریک کے زیر اثر جنوبی ایشیا میں ہمیں پے در پے ایسی متعدد شخصیات نظر آتی ہیں جنہوں نے اس فریضے کو انجام دیا۔ سب سے پہلے تو اکبر الٰہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶ء) نے اپنی طنزیہ شاعری میں اس جمود کو توڑا۔ ان کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸-۱۸۸۸ء) نے "الہلال" اور "حزب اللہ" کے ذریعہ اُمت کی بیداری وراہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے بعد علامہ محمد اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۷ء) جیسی قد آور شخصیت پیدا ہوئی جس کی ساحرانہ شاعری اور شہرہ آفاق خطبات "The Reconstruction Of Religious Thought In Islam" نے مسلمانوں میں بہت حد تک اس احساس مرعوبیت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے ماضی پر فخر کرنے کی تلقین کی۔ پھر اقبال ہی کے ایک دوست علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ وائس، ۱۹۹۲-۱۹۰۰ء) جنہوں نے علامہ اقبال کی ایماء پر قرآن مجید اور صحیح بخاری کے بعض اجزاء کا نہایت شان دار انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور نہایت گراں قدر تصانیف "Islam at the Crossroads" اور "The Principles of State and Government in Islam" نے اُمت مسلمہ کو مغربیت کی سحر سے نکالنے میں بہت واضح کردار ادا کیا۔ ان کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) نے اسی فکری تحریک کو آگے بڑھایا اور اپنی تحریروں بالخصوص "تنقیحات" کے ذریعے مغربی نظام فکر اور فلسفے پر علمی انداز میں کڑی تنقید کی اور سیاست، معیشت اور معاشرت کے میدانوں میں مغربی نظام ہائے فکر کے متبادل پیش کیے۔ افغانی کی برپا کردہ تحریک کے زیر اثر جنوبی ایشیا سے باہر بھی ایسے متعدد مفکرین پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے بلاد واوطان میں مغرب سے مرعوبیت کی فضا ختم کرنے کی تحریکیں برپا کیں۔ ان میں مصر میں سید رشید رضا (۱۹۳۵-۱۸۶۵ء)، مصطفی کامل (۱۸۷۴ء-۱۹۰۸ء)، حسن البناء شہید (۱۹۴۹-۱۹۰۶ء) اور سید قطب شہید (۱۹۶۶-۱۹۰۶ء) کی صورت میں مفکرین کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی (۱۸۸۵-۱۸۴۵ء)، لیبیا میں سید احمد سنوسی (۱۹۳۳-۱۸۷۳ء)، الجزائر میں امام مسالی حج، شیخ عبدالحمید بن بادیس (۱۹۴۰-۱۸۸۹ء) اور شیخ الطیب العقابی (۱۹۶۵-۱۸۸۹ء)، مراکش میں غازی عبدالکریم خطابی (۱۹۶۳-۱۸۸۲ء) اور علال الفاسی (۱۹۵۶-۱۹۱۰ء)، انڈونیشیا میں تیکو عمر (۱۸۹۹-۱۸۵۴ء)، شیخ وحی الدین اور عمر سعید آمینوتو، ملائشیا میں شیخ جلال الدین طاہر (۱۹۵۶-۱۸۶۹ء)، افغانستان میں نادر شاہ غازی (۱۹۳۳-۱۸۸۳ء) اور ترکی میں شیخ بدیع الزمان سعید نورسی (۱۹۶۰-۱۸۷۳ء) اور حلیم پاشا (-۱۸۶۳ ۱۹۲۱ء) یہ سب وہ مفکرین ہیں جنہوں نے مسلمانوں میں مغرب سے مرعوبیت ختم کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ان میں سے بہت سے مفکرین کے کام کے نتیجے میں ان ممالک میں سیاسی تحریکیں بھی چلیں اور بالآخر یہ ممالک مغرب سے آزاد ہوئے۔

افغانی اور ان کے بعد کے مذکورہ بالا تمام مفکرین کی یہ پوری تحریک مسلمانوں میں مغرب سے مرعوبیت کو مکمل طور پر ختم تو نہ کر سکی تاہم اس کے زیر اثر مسلمانوں کے اندر ایک طبقہ بہر حال ایسا پیدا ہو گیا جو مغرب کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار نہ تھا۔ بعض لوگ تو اس معاملے میں دوسری انتہاء پر چلے گئے اور احساس کمتری کو چھوڑ کر وہ احساس برتری میں مبتلا ہو گئے اور مغرب کی ہر چیز کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

مدحت پاشا اور مصطفی فاضل پاشا کی جدوجہد

مدحت پاشا

ابوالاحرار مدحت پاشا(۱۸۸۳-۱۸۲۲ء)کا اصل نام احمد شفیق، اور تخلص مدحت تھا۔ ملت عثمانی میں تحریک قوم پرستی کے بانی 1822 میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر عبید اللہ فلاحی ان کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''پہلے مشرقی علوم عربی و فارسی کی تحصیل کی اور ان میں مہارت پیدا کرنے کے بعد باب عالی میں ملازمت اختیار کر لی، پھر مغربی فکر و منہاج کے علم بردار رشید پاشا کی ہمت افزائی پر فرانسیسی زبان سیکھی اور اس میں بھی کمال پیدا کیا۔ ۱۸۶۰ء میں نیش کے والی اور ۱۸۶۴ء میں تین سال کے لیے طونہ کے والی بنائے گئے۔''[10] ۲۲ سال کی عمر میں فائق آفندی کے سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد رومیلیا کے گورنر بنا دیئے گئے۔ وہاں کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد واپس آ گئے۔ ۱۸۵۷ء میں بلغاریہ میں بغاوت ہوئی تو اس کو کچلنے کے لیے ایک بار پھر انہی کو چُنا گیا۔ اس کے بعد نیش کی گورنری اُن کے سپرد ہوئی۔ وہاں انہوں نے داخلی نظم و ترتیب کے متعلق کچھ اصلاحی تجاویز مرتب کیں۔ یہ تجاویز سلطان کو بہت پسند آئیں، اس کے بعد سلطان نے فواد پاشا اور عالی پاشا کے مشورہ سے ان کو تمام سلطنت کے لیے اصلاحی تجاویز مرتب کرنے کا حکم دیا۔ ۱۸۶۶ء میں مجلس حکومت کے قواعد میں ترمیم کرائی لیکن چند دنوں بعد اُن کو عراق کے حالات کی درستی کے لیے گورنر بنا کر بغداد بھیج دیا گیا۔ وہ تمام عمر یہی کوشش کرتے رہے کہ ملک کے اندرونی انتظامات میں ایسی اصلاحات کرائی جائیں جن سے حکومت تقویت حاصل کرے اور رعایا کو مشکلات و مظالم سے نجات مل جائے۔ قاضی عبدالغفار ان کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''قسطنطنیہ میں اُن کے خیالات کے سخت مخالف ندیم پاشا وزیر اعظم تھے اور وہ مدحت پاشا کی تجاویز کو کسی طرح قبول نہ ہونے دیتے تھے مگر مدحت سلطنت کی بدحالی کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے اور بار بار سلطان کو اُس کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے ایک دفعہ تو اُنہوں نے تنگ آ کر یہ جرأت کی کہ سلطان کو ایک خط لکھا جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ ''آپ ایک بڑی خندق کے کنارے آ گئے ہیں'' اس زمانہ میں ایسی جرأت وہی مخلص قوم پرست کر سکتا تھا جس کو شاہی انعام واکرام کی پروانہ ہو، یہ خط لکھنے کے بعد انہوں نے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور قسطنطنیہ واپس آ گئے۔''[11]

استعفیٰ دینے کے بعد وہ اور زیادہ بے باکی اور جرأت کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت میں مشغول ہو گئے چنانچہ انہوں نے اپنی جماعت کو منظم کر کے، شیخ الاسلام کو اعتماد میں لے کر اور فتویٰ حاصل کر کے سلطان عبدالعزیز کو معزول کرا دیا۔ اس کے بعد

---

10 عبید اللہ فہد فلاحی، جدید ترکی میں اسلامی بیداری (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نومبر ۱۹۹۹ء)، ۳۱۹۔

11 عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی، ۲۰۔

سلطان عبد الحمید ثانی (۱۹۱۸-۱۸۴۲ء) کو تخت نشین کرانے والی بھی انہی کی جماعت تھی۔ سلطان عبد الحمید نے مدحت پاشا سے یہ عہد و پیمان کر لیا تھا کہ وہ تخت نشین ہو کر مجوزہ اصلاحات کو ملک میں نافذ کریں گے۔ چنانچہ سلطان نے تخت نشینی کے بعد مدحت پاشا کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور بڑی شان و شوکت سے ترکی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا، لیکن دراصل یہ سلطان کی حکمت عملی تھی۔ انہیں اپنی استبدادیت اور مطلق العنانی میں ذرہ بھر کمی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ جب سلطان عبد الحمید خان نے دیکھا کہ پارلیمنٹ میں مدحت پاشا کی قوت و طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے اور سلطانی اختیارات کم ہوتے چلے جاتے ہیں تو انہوں نے مدحت کی طاقت توڑنے کے لیے ان پر ایک سازش میں شریک ہونے کا الزام لگا کر ان کو خارج البلد کرا دیا اور ساتھ ہی ان کے لیے پارلیمنٹ کے دروازے بند کرا دیئے۔ اس کے باوجود سلطان ان کی طرف سے مطمئن نہ تھا وہ جانتا تھا کہ جب تک مدحت زندہ ہے دستوریت کی تحریک بھی ترکی میں زندہ رہے گی اور ان کی اصلاحات کی تجاویز کو قطعاً منسوخ کر دینا بہت مشکل ہو گا۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں سمرنا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ لیکن پھر دفعتاً انہیں سلطان عبد العزیز کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلا کر انہیں سزائے موت سنا دی گئی۔ مگر اس وقت کے برطانوی سفارت خانہ کی ہمدردیاں مدحت کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ برطانوی سفیر کی مداخلت سے ان کی سزائے موت کو نظر بندی میں بدل دیا گیا اور مدحت کو طائف کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن یہ نظر بندی بھی صرف چند روز کے لیے برطانوی سفارت کو مطمئن کرنے کے لیے محض ایک چال تھی۔ قاضی عبد الغفار ان کے انجام کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "عبد الحمید کے دل میں وہی ایک خیال جما ہوا تھا کہ جب تک مدحت زندہ ہیں میرا تاج و تخت محفوظ نہیں، اس لیے ۲۶ جولائی ۱۸۸۳ء کو حالت نظر بندی میں مدحت کو قتل کر دیا گیا۔ اس میں کلام نہیں کہ مدحت ترکی میں مطلقیت کے سب سے سخت دشمن اور حریت و عصبیت قومی کے سب سے پہلے علم بردار تھے جنہوں نے سلطان کی مطلقیت کے خلاف قوم پرست جماعت کو منظم کر دیا۔ بلاشبہ ترکی میں مدحت ہی کی جدوجہد اور قربانی سے تحریک آزادی کا نیا دور شروع ہوا اور انہیں کے نصب کیے ہوئے سنگِ بنیاد پر سید جمال الدین نے قوم پرستی کی عمارت تیار کی۔"[12]

مولانا ابوالکلام آزاد مدحت پاشا کے عزم و استقلال اور ایثار و قربانی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اب تک کوئی شخصیت ایسی نمایاں نہیں ہوئی تھی جسے اس راہ میں جاں فروشی و قربانی کی منزل سے گزرنا پڑا ہو۔ یہ منزل ایک اولوالعزم شخصیت کے ظہور کی منتظر تھی، یہ اولوالعزمی مدحت پاشا کی شخصیت میں ظاہر ہو گئی۔ مدحت اس راہ کا پہلا قتیل و شہید ہے۔ اس کے خون نے وہ آبیاری بہم پہنچادی جس کے بغیر یہ تخمِ انقلاب بارآور نہیں ہو سکتا تھا۔"[13] مزید لکھتے ہیں: "مقدمہ کے بعد مدحت پاشا کو طائف کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور کچھ دنوں کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اس وقت دنیا اِس مظلوم کو بالکل بھلا چکی تھی۔ اصلاح پسند ترکوں کے سوا جو یورپ میں منتشر ہو چکے تھے، کوئی جماعت ایسی نہ تھی جسے حقیقت حال کا علم ہو یا اس کی شخصیت

---

12 عبد الغفار،، آثار جمال الدین افغانی، ۳۲۹۔

13 آزاد، تاریخی شخصیتیں، ۱۰۴

میں دل چسپی ہو۔"[14] عرصہ دراز تک اس مظلوم و قتیل کی ہولناک موت کی حقیقت پر پردہ پڑا رہا۔ قسطنطنیہ میں عہد حمیدی کے تمام مستبدانہ اعمال اپنی پوری گرم جوشی کے ساتھ جاری رہے۔ مدحت پاشا اور اس کے رفقا کا نام لینا بھی ناقابل معافی جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ جیسا کہ "اصلاح"، "دستور" اور "پارلیمنٹ" کا نام لینا۔ کئی کتب کی اشاعت محض اس بنا پر روک دی گئی کہ ان کے مصنّفین کے نام بھی "مدحت" تھے۔ تمام حقائق ان کی موت کے بعد ان کی خود نوشت سے آشکارا ہوئے جو ان کی موت کے بیس برس بعد ان کے بیٹے علی حیدر بک نے برسوں کی تلاش بسیار اور تحقیق کے بعد مکمل کر کے شائع کی۔

مصطفی فاضل پاشا

انیسویں صدی کے وسط میں دولتِ عثمانیہ کی سیاسی واجتماعی اصلاحات کا جو آغاز ہوا، عام طور پر اس کی تخم ریزی مرحوم مدحت پاشا کی طرف منسوب کی گئی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مدحت پاشا اس روحِ تجدید کا داعی اوّل نہ تھا۔ اسے منظم و وسیع کرنے والے، ترکی اصلاح و تجدید کی اصلی تاریخ مصطفی فاضل پاشا (۱۸۷۵-۱۸۳۰ء) سے شروع ہوتی ہے، دراصل نوجوان ترکوں کی اجتماعی حرکت کے حقیقی بانی وہی تھے۔ استانبول میں جس شخص نے یورپ کے تمدنی انقلاب کا سب سے پہلے مطالعہ کیا وہ مصطفی فاضل پاشا تھے۔ وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے یورپ کی زبانوں سے واقفیت حاصل کی۔ مصطفی فاضل پاشا، محمد علی (-۱۷۶۹ ۱۸۴۹ء) بانیٔ خاندان خدیویہء مصر کے پوتے اور ابراہیم پاشا (۱۸۴۸-۱۷۸۹ء) فاتح حجاز و شام کے بیٹے تھے۔ ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور مصر میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔[15] مصر میں محمد علی کے زمانے سے مغربی علوم والسنہ کی اہمیت کا احساس عام ہو چلا تھا اور خاندان خدیویہ کے تمام افراد فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ مصطفی فاضل پاشا کو بھی اس کا موقعہ ملا، اس طرح مغربی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کے فہم و مطالعہ کا دروازہ ان پر کھل گیا۔ استانبول آنے پر انہیں وزیر مالیات بنا دیا گیا۔ انہوں نے اپنے دورِ وزارت میں تعلیمی و معاشرتی اصلاحات کی جو روح پیدا کی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک قلیل جماعت نئے تعلیم یافتہ افراد کی پیدا ہو گئی۔ اس جماعت سے دو سب سے زیادہ معروف اور نامور شخص عالی پاشا (۱۸۲۲-۱۷۴۴ء) اور فواد پاشا (۱۸۶۹-۱۸۱۴ء) تھے جنہوں نے صدارت و نظارت تک کے مناصب پر ترقی پائی اور اپنے عہد کے مشاہیر مدبرین میں شمار ہوئے۔

سلطان عبد العزیز (۱۸۶۱ء-۱۸۷۶ء) کے زمانہ میں کارخانہء سلطنت روز بروز درہم برہم ہو رہا تھا اور آنے والے خطرے کے آثار قریب سے قریب تر ہونے لگے تھے۔ اِدھر یہ حالات تھے مگر اُدھر سلطانی محلات میں غفلت و اعراض کا سناٹا چھایا ہوا تھا، کوئی صدا نہ تھی جو کلمہء حق و اصلاح سے آشنا ہوتی۔ لیکن غفلت و فساد کے اس سکون میں بالآخر حرکت ہوئی اور دولتِ عثمانیہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دعوت الی الحق کی بے خوف صدا بلند ہوئی۔ یہ مصطفی فاضل پاشا کی صدا تھی، وہ صدائے حق و صداقت جسے نہ تو سلطان عبد العزیز کی سطوت و جبروت روک سکی، نہ امارت و وزارت کی اطاعت ہی ان کی راہ میں حائل ہو سکی۔ مولانا ابو الکلام آزاد مصطفی فاضل پاشا کی بیدار مغزی اور حریت و استقلال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "تاریخ میں یہ صدائے

---

14 آزاد، تاریخی شخصیتیں، ۱۰۵

15 آزاد، تاریخی شخصیتیں، ۱۰۵

اصلاح "لائحہ اصلاحیہ" کے نام سے مشہور ہے، یہ دراصل ایک مکتوب ہے جو سلطان عبد العزیز کے نام لکھا گیا تھا۔ مصطفی فاضل نے یہ مکتوب ۱۸۶۷ء میں لکھا، بذاتِ خاص سلطان کے حوالہ کیا۔ لوگوں کو جب اس جسارت کا حال معلوم ہوا تو شدّت تحیّر سے انگشت بدنداں رہ گئے۔ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں یہ بالکل ایک نئی قسم کی جسارت تھی۔ ایسی جسارت جس کی مصطفی رشید، فواد پاشا اور عالی پاشا جیسے مصلحین بھی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔"[16]

مصطفی فاضل پاشا کو اس جسارت کا خمیازہ صرف جلاوطنی کی صورت میں ہی نہیں بلکہ تمام ترکی جائیداد کی ضبطی کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ اگر فرانسیسی حکومت درمیان میں نہ پڑتی تو شاید مصری جائیداد سے بھی محروم ہو جاتے۔ ان کا "لائحہ اصلاحیہ" جدید مشرقی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، جس جرأت و دلاوری سے اور صراحت کے ساتھ سلطانِ وقت کو مخاطب کیا گیا ہے اس کی نظیر اس عہد میں نہیں مل سکتی۔ جلاوطنی کے بعد پاشا کو پیرس آنا پڑا۔ ان کے بعد بعض دیگر اصحابِ بصیرت نوجوان بھی ان کی اتباع میں پیرس پہنچ کر ان کی زیر سرپرستی متحدہ و متفقہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اس عہد کے وہ تمام اصلاح پسند افراد جنہوں نے نہ صرف ترکی میں سیاسی انقلاب کی تخم ریزی کی بلکہ ترکی علم وادب و کتابت میں بھی دورِ جدید کی بناڈالی۔ نامق کمال بے (۱۸۴۰-۱۸۸۸ء)، ضیاء پاشا ادیب (۱۸۲۵-۱۸۸۰ء)، سعد اللہ پاشا اور مراد ابولضیاء توفیق (۱۸۴۹-۱۹۱۳ء) وغیرہم کی نشوونما اسی عہد میں مصطفی فاضل پاشا کی زیر تربیت ہوئی۔ مولانا ابوالکلام مزید لکھتے ہیں: "مصطفی رشید، فواد اور عالی پاشا نے اصلاح و تغیر کے لیے فضا پیدا کر دی، مگر جماعت پیدا کرنے کا کام بعد کو ہونے والا تھا، یہ مصطفی فاضل پاشا کی شخصیت تھی جس نے اس نئی فضا کو نشوونما دی اور "نوجوان" ترکوں کی جمعیت کا اوّلین سنگِ بنیاد رکھ دیا۔ مدحت پاشا بعد کو آیا تاکہ اپنے عظیم اعمال اور عظیم قربانی سے اس سنگ بنیاد پر ایک نئی عمارت چن دے۔"[17]

اسلام پسندوں کی جدوجہد

سنہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں وزیر اعظم ترگت اوزال (۱۹۹۳-۱۹۲۷ء) نے بہت سی معاشی اصلاحات کیں جن کے نتیجے میں اسلام پسندوں کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ اس سے پہلے ترکی کی معیشت پر زیادہ تر کنٹرول حکومت کا تھا مگر اوزال نے پرائیویٹ سرمایہ کاری کی اجازت دے دی۔ اس کے نتیجے میں امیر مذہبی لوگوں نے سرمایہ کاری کرنا شروع کی اور بہت سے کاروباروں پر چھاگئے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ صنعتیں قائم کرنا شروع کیں، صنعتوں کے قیام کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ دیہات سے لوگ شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ اس زمانے میں ترکی کے زیادہ تر شہر مغرب زدگی کی لپیٹ میں آچکے تھے جب کہ ان کے دیہاتوں میں ابھی تک دین کو اہمیت دی جاتی تھی، نتیجتاً جب یہ دیہاتی شہروں میں آکر آباد ہوئے تو انہیں بالکل ہی مختلف ماحول سے سابقہ پڑا جس کی وجہ سے ان کے لیے شہروں میں سیٹل ہونا آسان نہ تھا۔ ان کے مسائل کے حل کے لیے اسلام پسند سیاسی جماعتوں کے کارکن آگے بڑھے، انہوں نے دیہات سے آنے والوں کو نوکری کی تلاش سے لے کر تعلیم اور میڈیکل تک کی سہولیات فراہم کیں۔ اس طرح اسلام پسند جماعتوں کو عام انتخابات میں زبردست پذیرائی ملی۔ اسی طرح بہت

---

16 آزاد، تاریخی شخصیتیں، ص۱۷۷

17 آزاد، تاریخی شخصیتیں، ۱۷۵

سے پرائیویٹ اسکول اور یونیورسٹیاں بنائی گئیں اور متعدد ٹیلی وژن چینل قائم ہوئے۔ اس کے نتیجے میں اسلام پسندوں کو اپنا پیغام پہنچانے کا موقع مل گیا۔

ملی گورش تحریک اور نجم الدین اربکان

ملی گورش تحریک استاد بدیع الزماں سعید نورسی کے نظریات کی پرچارک تھی۔ اس تحریک کے نتیجے میں بہت سے لوگ دین کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس تحریک کے سابق کارکنان میں نمایاں ترین نام نجم الدین اربکان (۱۹۲۶ء-۲۰۱۱ء) بھی شامل تھے۔ پروفیسر نجم الدین اربکان ترکی کی شمالی سرحد پر بحر اسود کے ساحلی شہر سینوپ میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد صبری سلجوقی سرداروں کے قبیلہ (بنو اوغلوللبری) سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا سلجوقی کابینہ کے آخری وزیر خزانہ تھے۔ اسی بنا پر ان کا گھرانہ ابن وزیر کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ جب ترکی میں خطابات کا قانون نافذ ہوا تو انہیں اربکان کے خطاب سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد گولن پروفیسر نجم الدین کی ابتدائی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "۱۹۴۳ء میں ثانوی تعلیم کی تکمیل کر کے استنبول کے انجینئرنگ کالج کے ٹیسٹ میں بیٹھے تو اتنے نمبر حاصل کیے کہ انہیں انجینئرنگ کے دوسرے سال میں داخلہ دے دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کامیابی حاصل کی تو یونیورسٹی ہی میں انہیں لیکچرار متعین کر دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء تک کے عرصہ میں انہوں نے کئی تحقیقی مضامین لکھے اور اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی تیار کر کے پیش کر دیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ ۱۹۵۲ء میں پی ایچ ڈی کی دوہری ڈگری لے ملک واپس آ گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پھر پروفیسر منتخب کر لیے گئے۔"[18] اربکان ۱۹۶۹ء تک یونیورسٹی میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بعض احباب کے ساتھ مل کر کئی صنعتی ادارے اور کارخانے بھی قائم کیے۔ ڈاکٹر صاحب ابتدائی عمر ہی سے نماز اور منصوبہ بندی کے بڑے پابند تھے۔ وہ شروع سے ہی یہ سمجھتے تھے کہ اسلام ہی راہِ نجات ہے جو نہ صرف ترکی کو بلکہ پوری انسانیت کو امن وامان اور سلامتی و کامرانی کے ساحل سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

ملی نظام پارٹی

سنہ ۱۹۶۹ء کے قومی الیکشن میں اربکان نے جسٹس پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب میں شریک ہونے کی کوشش کی مگر پارٹی قیادت نے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تو انہوں نے آزاد اُمیدوار کے طور پر انتخاب میں حصہ لیا اور تاریخ ساز کامیابی حاصل کر کے پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے ارکانِ پارلیمنٹ میں جلد ہی اپنا حلقہ احباب ترتیب دے لیا اور اپنے ہم خیال ارکان سے مل کر ۱۹۷۰ء میں "ملی نظام پارٹی" یا "قومی آرڈر پارٹی (MNP)" کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی جسے فوج نے مداخلت کر کے خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس جماعت کا نشان بند مُٹھی تھا جو اتحاد واستحکام کی علامت ہے اور شہادت کی انگلی ہوا میں لہراتی ہوئی روشن مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ پروفیسر محمد اجتباء ندوی ان کی پارٹی کی اسلام پسندی کی بارے میں وضاحت کرتے ہوئے ان کے منشور کے حوالے سے لکھتے ہیں: "پارٹی کی جانب سے ایک اعلانیہ نشر کیا گیا جس میں ترکی کے ماضی، حال اور مستقبل کا تجزیہ پیش کیا گیا اور واضح الفاظ میں صراحت کی گئی کہ اس پارٹی کا رکن صرف وہی ہو سکتا ہے جو پنج وقتہ

---

18 آزاد، تاریخی شخصیتیں، ۹۷

نماز کا پابند ہو اور اس کے صلاح، تقویٰ اور استقامت کے بارے میں اطمینان کر لیا گیا ہو، پارٹی کا اوّلین مقصد ملک میں نظم وضبط، خوشحالی و ترقی اور خیر و فلاح کو عام کرنا ہے۔ اس کا مقصد اُمت کی عظمت رفتہ کا احیاء ہے۔ یہ اُمت اخلاق و فضائل کے زبردست ذخیرہ کی مالک ہے، اس کی تاریخ تابناک ہے، دورِ حاضر میں اس کا صاحب ایمان نوجوان یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ وطن عزیز اور اس کے مسائل و مشکلات کو سمجھ کر اس کا مداوا کر سکے۔"[19] اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں قومی نجات پارٹی (MSP) کی بنیاد رکھی۔ ان کا نعرہ تھا کہ ترکی کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی طرف واپس جایا جائے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشروں میں بڑے پیمانے پر ترکی میں اسلام پسندی کے رُجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۳ء کے الیکشن میں MSP نے تیسری پوزیشن حاصل کی اور کمالسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد میں یہ لوگ سلیمان ڈیمرل کی حکومت میں شریک رہے۔ ۱۹۸۰ء میں فوج نے مداخلت کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور مارشل لاء نافذ کر کے MSP کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس کے بعد اربکان نے ۱۹۸۳ء میں نئی رفاہ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اسلام پسندوں نے عوامی فلاح و بہبود کے پراجیکٹس کے ذریعے ان کی حمایت حاصل کرنے کی اپنی حکمت عملی کو جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۹۴ء کے بلدیاتی انتخابات میں رفاہ پارٹی نے ۲۸ شہروں میں اکثریت حاصل کر لی جن میں استنبول اور انقرہ بھی شامل تھے۔ ۱۹۹۵ء کے قومی انتخابات میں بھی رفاہ پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی جس کے نتیجے میں اربکان وزیر اعظم بن گئے۔ رفاہ پارٹی کی کامیابی کی اصل وجہ اس کا عوامی نیٹ ورک تھا۔ یہ نیٹ ورک قائم کرنے میں اس کی خواتین ورکرز کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان خواتین نے گھر گھر جا کر تعلیم اور صحت کی سہولیات فراہم کیں جس کی وجہ سے رفاہ پارٹی کے عوامی نیٹ ورک کو غریب طبقے میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ پروفیسر نجم الدین اربکان کی احیائے اسلام کی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبید اللہ فہد رقم طراز ہیں:

> "اربکان بھی واضح طور پر سیکولرازم کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ پاکستان کے دورہ کے موقع پر انہوں نے تمام سیاسی احتیاط اور اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر لادینیت کے خلاف تقریر کی۔ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کرتے ہوئے انہوں نے زور دیا کہ ایک اسلامی ریاست کی بنیادی شرط یہ ہے کہ پوری زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ سب سے پہلے اسلام کو سرکاری مذہب ہونا چاہیے اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمانوں کا مذہب خطرہ میں رہے گا۔"[20]

ملی سلامت پارٹی

مئی ۱۹۷۱ء میں ملی نظام پارٹی کی اسلامی جدوجہد اور عوامی مقبولیت سے گھبرا کر ترکی کے فوجی عناصر نے انقلاب برپا کر دیا اور پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے کر تمام سرگرمیوں پر پابندی لگا دی تا کہ ملک سیکولر اتاترک نظریہ کی راہ پر گامزن رہے اور اسلامی نظام کی راہ ہموار نہ ہو سکے۔ بدلتے ہوئے حالات میں اسلامی تحریک کے سربراہ پروفیسر نجم الدین اربکان نے

---

19 محمد اجتباء ندوی، مضمون: "ترکی کے نئے وزیر اعظم پروفیسر نجم الدین اربکان"، مشمولہ: پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ، شمارہ: ۲۵ جولائی ۱۹۹۶ء، ۱۹-۱۷

20 فلاحی، جدید ترکی میں اسلامی بیداری، ۱۲۷

نئی حکمت عملی اپنائی اور ۱۹۷۲ء میں "ملی سلامت پارٹی" کے نام سے ایک نئی جماعت کی تشکیل کی۔ ۱۹۷۳ء میں پارلیمانی انتخابات ہوئے تو ملی سلامت پارٹی نے اس میں شریک ہو کر ۱۱ فی صد ووٹ حاصل کیے اور ۴۸ نمائندے پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ۔اس سے ثابت ہو گیا کہ ترکوں میں ابھی اسلام سے محبت وعقیدت کا جذبہ موجود ہے۔ ۱۹۷۸ء میں ایرانی انقلاب نے ترکی کے عوام پر بھی اثر ڈالا اس سے ترکی میں بھی مغرب کے خلاف نفرت اور اس سے جہاد کے جذبات نے مسلمانوں کے دل میں انگڑائی لی۔ ملت سلامت پارٹی اور اس کے رہنما، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک بار پھر ہر دل عزیز اور سوالیہ نشان بن گئے اور ترکی میں اسلامی انقلاب کی دھمک سنائی دینے لگی۔ اس سے گھبرا کر فوج کے ایک دستے نے انقلاب برپا کر کے عوامی حکومت کا خاتمہ کر کے پارلیمنٹ توڑ دی اور اقتدار پر قابض ہو کر اسلام پسندوں کے خلاف قانونی اور سیاسی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ پروفیسر اربکان کو بھی اس جرم میں کہ انہوں نے سیاسی مقاصد کے لیے اسلام کو استعمال کیا تھا اور ملک کے سیکولر کردار کو چیلنج کیا تھا، زندان میں ڈال دیا گیا۔ تاہم فوجی قیادت کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہو گیا کہ اب پچھلی تین دہائیوں میں ترکی سیاست میں جو ارتقاء ہوا ہے اور اسلام سے محبت وعقیدت کے جذبات میں جو تیزی آئی ہے اسے زیادہ دنوں تک دبایا نہیں جاسکتا۔ بنیادی انسانی حقوق اور جمہوریت کے تعلق سے بھی ملی سلامت پارٹی اور اس کے ہم نوائوں اور رہنمائوں کا موقف اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔ انہوں نے ایک طرف آزادئ فکر و نظر اور اظہار رائے کی مکمل حمایت کی اور کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے عناصر کے لیے بھی آزادی وحریت کی وکالت کی اور دوسری طرف اس موقف کا بھی کھل کر اظہار کیا کہ ترکی ایک مسلم ملک ہے اور یہاں اسلام کی بالادستی ہونی چاہیے۔

رجب طیب اردگان

ترکی کی فوج نے نیشنل سیکورٹی کونسل کے نام سے ادارہ قائم کیے رکھا جس کے ذریعے فوج نے ملک کے حقیقی اقتدار پر قبضہ برقرار رکھا۔ ۱۹۹۷ء میں اس کونسل نے اربکان کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور اگلے برس رفاہ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے بعد فوج نے کھلے عام اسلام پسندوں کے نظریات کے خلاف مہم چلانا شروع کر دی۔ اربکان نے فضیلت پارٹی کے نام سے ایک اور پارٹی بنائی جس پر آئینی عدالت نے ۲۰۰۱ء میں پابندی عائد کر دی۔ اس کے بعد اسلام پسندوں کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصہ سعادت پارٹی اور دوسرا انصاف و ترقی پارٹی (AKP) کی صورت اختیار کر گیا۔ AKP کے لیڈر رجب طیب اردگان (۱۹۵۴ء) تھے جو ترکی کے وزیر اعظم بنے۔ اردگان نے ایک دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کی اور طویل سفر طے کر کے اس عہدے تک پہنچے۔ وہ انقرہ کے میئر بھی رہے اور اس دوران میں انہوں نے غیر معمولی خدمات سرانجام دیں اور بڑی حد تک کرپشن کا خاتمہ کر دیا۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں AKP کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ انہیں ۳۴ فی صد ووٹ ملے جب کہ دوسرے نمبر پر آنے والی کمالسٹ پارٹی (CHP) کو محض ۱۹ فی صد ووٹ مل سکے۔ اربکان مغربی ممالک کے سخت مخالف تھے اور ان کی نظریاتی بنیاد ہی مغرب کی مخالفت پر تھی۔ اس کے برعکس AKP نے مغربی ممالک سے اچھے تعلقات قائم رکھے اور مغرب کی سیاسی اقدار جیسے انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کے احترام پر زور دیا۔ AKP کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عوام سیکولر پارٹیوں کی کرپشن سے سخت نالاں تھے اور اب تبدیلی چاہتے تھے۔ AKP نے اپنے دورِ اقتدار میں عوام کی خدمت کو

نصب العین بنایا جس کے نتیجے میں ۲۰۰۷ء کے انتخابات میں انہیں پہلے سے بڑھ کر کامیابی ملی۔ انہوں نے ۴۶ فی صد ووٹ حاصل کیے اور بغیر کسی سے اتحاد بنائے یہ پارٹی حکومت بنانے کے قابل ہوگئی۔ ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں انہوں نے ۴۹ فی صد ووٹ حاصل کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم رکھا۔ اب تک یہ صورت حال رہی تھی کہ ہر وہ پارٹی جسے اسلام پسندوں کے سرخیل پروفیسر نجم الدین اربکان تشکیل دیتے رہے تھے، فوجی جرنیل کام شروع کرنے سے پہلے ہی اسے کالعدم قرار دے دیتے تھے، ان کے پیروکاروں خصوصاً طیب اردگان کے لیے جو کہ استبدال کے سابق میئر رہے تھے، بہت زیادہ پریشان کن تھی۔ چنانچہ طیب اردگان اوران کے دست راست عبداللہ گل اس نتیجے پر پہنچے کہ جرنیلوں کے ساتھ اربکان کا براہِ راست تصادم اسلامی کاز کے حق میں مفید نہیں ہے، اور یہ کہ اگر جرنیلوں کو ان کی حدود میں رکھنا ہے اور ترکی میں احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنی ہے تو ایک نئی اپروچ کی ضرورت ہے، خصوصاً ایسی حالت میں، جہاں سیکولرازم ۱۹۲۴ء سے مسلسل اقتدار میں چلا آرہا ہو اور یہ تصادم تمام اداروں کی رگ وپے میں سرایت کر گیا ہو۔ سید قاسم محمود اس صورت کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں: "اس نقطہء نظر کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی میں پروفیسر اربکان کے خلافت بغاوت ہوئی اور جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی وجود میں آئی، جس سے ترکی نام کا مخفف AKP بنتا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں اردگان نے اپنی پارٹی کو حیرت انگیز فتح دلائی، اس طرح کہ ۵۰۰ کی پارلیمنٹ میں ۳۶۳ نشستیں حاصل کیں۔ دو تہائی اکثریت کے حصول میں صرف چار نشستیں کم رہ گئیں، جس کے ساتھ ترکی کی ایک ایوانی پارلیمنٹ میں آئین میں ترمیم کرانے کا مجاز ہو سکتی تھی۔ اس طرح دس برسوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جو مخلوط نہیں تھی۔"[21]

ترکی میں اسلام پسند پارٹیوں کی انتخابی کامیابی کے بعد سے لے اب تک ترکی میں AKP کی حکومت ہے۔ AKP نے سیکولر آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے حجاب پر عائد پابندی کو ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی تعلیم وتربیت کو فروغ دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلم قوتوں سے اچھے تعلقات استوار رکھے ہیں۔ اردگان کی حکومت نے ملک کی معاشی ترقی پر خاص توجہ دی ہے اور یورپی یونین میں ترکی کی شمولیت کا مقدمہ لڑا ہے۔ ترکی وہ واحد اکثریتی ملک ہے جس کے اسرائیل سے سفارتی تعلقات ہیں لیکن ۲۰۰۸ء میں جب اسرائیل نے غزہ کی ناکہ بندی کی تو اردگان نے اس پر کڑی تنقید کی اور اسرائیل کے ساتھ مذاکرات سے واک آئوٹ کیا۔ ان کے اس اقدام کو ترک عوام نے بہت سراہا اور ان کی واپسی پر شدید سردی میں گھنٹوں کھڑے رہ کر ان کا استقبال کیا۔ ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں اردگان مسلسل تیسری مرتبہ ترکی کے وزیر اعظم منتخب ہوئے اور ان کی پارٹی کو دیئے جانے والے ووٹ پہلے سے زیادہ تھے۔ نئے وزیر اعظم طیب اردگان نے ایسے جذباتی نعروں اور برانگیختہ کرنے والے بیانات جاری کرنے بند کر دیئے جو اربکان کا طرئہ امتیاز تھے۔ انہوں نے یورپی یونین کو "مسیحی کلب" کہنا شروع کر دیا اور ایسی "نئی دنیا" کی باتیں شروع کر دیں جو قازقستان سے مراکش تک کے علاقوں پر محیط تھی۔ دوسری طرف اردگان نے یہ مصلحت آمیز عہد کیا کہ وہ ترکی کے سیکولر آئین کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ساتھ ہی یہ وضاحت کی کہ وہ ترکی یورپی یونین میں شمولیت کی درخواست کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے ایسی اصلاحات متعارف

---

21 قاسم محمود، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالمِ اسلام (لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، ۲۰۱۲ء)، ۶۸۴۔

کرانے پر بھی آمادگی کا اظہار کیا جو کوپن ہیگن کے معیارات سے مطابقت رکھتے ہوں، ان اصلاحات میں سزائے موت کا خاتمہ، ان قوانین میں ترمیم جن سے آزادئ اظہار سلب ہوتی ہو، نیز کردوں کو ان کے ثقافتی حقوق دینا شامل تھے۔ تاہم AKP کی اسلام پسندی اور اسلامی سرچشموں سے گہری وابستگی کے باوجود طیب اردگان نے آئین کے سیکولر کردار میں تبدیلی وترمیم کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ انہوں نے واضح طور پر انکار کر دیا کہ ترکی کی سمت یورپی ہی رہے گی اور بالآخر وہ ۲۰۰۵ء میں اپنی پالیسی میں کامیاب ہوگئے، جب یورپی یونین نے اپنے اندر ترکی کی شمولیت کے ضمن میں، ترکی کے ساتھ مذاکرات کا دروازہ کھول دیا۔ سید قاسم محمود لکھتے ہیں: "سب سے اہم بات اردگان کی اقتصادی میدان میں کامیابی تھی۔ بیرونی سرمایہ کاری بڑھ گئی، بے روزگاری کم ہوگئی اور افراطِ زر کی شرح اس حد تک گری کہ یک ہندسہ رہ گئی۔ ۲۰۰۷ء کے لیے افراطِ زر کی شرح میں کمی کا ہدف ۴ فی صد مقرر کیا گیا۔ اربکان کے برعکس اردگان نے جرنیلوں کے ساتھ معاملہ بڑے تدبر اور ذہانت کے ساتھ کیا۔ جب وہ اقتدار میں آئے تو "قومی سلامتی کونسل" میں بالادستی فوج کو حاصل تھی اور کونسل کے فیصلے ماننا حکومت پر لازم تھا۔ "ساتویں ریفارم پیکج" کے طفیل جسے پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا، فوج کا قومی سلامتی کونسل پر سے کنٹرول ختم ہوگیا۔ ان آئینی اصلاحات کی وجہ سے کونسل ایک ایسی مشاورتی مجلس میں تبدیل ہو کر رہ گئی جس کی تجاویز کا تعلق صرف فوجی اور سلامتی اُمور سے ہو۔"[22] ترکی کی اس دینی وسیاسی تحریک AKP کو عالم اسلام میں بالعموم قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تاہم اس پر سیکولر اور کٹرمذہبی حلقوں کی جانب سے تنقید بھی کی جاتی ہے۔ سیکولر حضرات کے نزدیک اردگان اور ان کی پارٹی خفیہ طور پر مذہبی ایجنڈے پر کام کر رہے اور ایک دن ترکی کو اسلامی ریاست بنا کر رہیں گے۔ جب کہ دوسری طرف کٹرمذہبی حلقوں کا موقف یہ ہے کہ اردگان نے سیکولر آئین کو قبول کرکے اور اس سے مفاہمت کرکے ایک غلط کام کیا ہے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ کھل کر سیکولر آئین کی مخالفت کرتے۔ اردگان کے یورپ اور امریکہ سے اچھے تعلقات کو بھی کٹرمذہبی حلقے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ان کی نظر میں اردگان اور ان کی پارٹی بہت ہی زیادہ جدت پسند (Modernist) ہیں۔ معروف ترک صحافی محمد نظام اوغلو نے ۱۸ مارچ ۱۹۹۷ء کو اربکان حکومت کے مستعفی ہونے کے بعد اپنے مقالہ میں نہایت شان دار تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"Refah can be banned and its leaders incarcerated and even hanged of assassinated. It happened in the past and it can happen again. However, the 74-years history of the republic has shown that it is impossible to try to repress the Islamic genius of its people. This genius is bound to assert itself more than ever before. But in the short term it would not be a bad idea to give the junta and its proxies as long a rope as they may need and invite them to go a head and implement

22 محمود، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالمِ اسلام، ص ۶۸۵

their 13-point plan for de-Islamizing Turkey. Let them hang themselves if they want to. Al-Asr, Time, is on the side of Muslims. It is for them to use time in a wise Islamic way." [23]

"رفاہ پر قدغن لگائی جاسکتی ہے اور اس کے رہنمائوں کو داروگیر میں مبتلا کیا جاسکتا اور پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جاسکتا ہے، یہ ماضی میں ہو چکا ہے اور اس کا اعادہ ممکن ہے مگر جمہوریہ ترکی کی ۷۴ سالہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے عوام کے اسلامی جذبہ کو دبایا نہیں جاسکتا۔ یہ جذبہء اسلامی ماضی سے کہیں زیادہ آج اپنی اہمیت منوانے کے لیے تیار ہے مگر مختصر مدت کے لیے یہ کوئی برا تجربہ نہیں ہو گا کہ ترکی کی فوج اور اس کے ہم نوائوں کی رسی اتنی دراز کر دی جائے جتنی کہ وہ چاہیں اور انہیں دعوت دی جائے کہ وہ آگے بڑھیں اور ملک کی اسلامی شناخت کو مسخ کرنے کے ۱۳ نکاتی ایجنڈے کو نافذ کریں، اگر وہ تیار ہیں تو انہیں پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنے دیں۔ کیوں کہ زمانہ مسلمانوں کے حق میں ہے۔ یہ اُن پر منحصر ہے کہ وہ دانش مندانہ اور اسلامی طریقے سے کس طرح اس فیصلہ کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔"

خلاصہ بحث

قیام جمہوریہ کے آغاز سے لے کر آج تک ترکوں کی اسلام پسندی نمایاں رہی ہے۔ جبر و اکراہ، طوق و سلاسل اور ترغیب و ترہیب کے حربے اور وسائل ان کی دینی حمیت، اسلامی غیرت اور ملی جذبہ کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے بلکہ صورت حال اس کے برعکس رہی ہے۔ ترکوں کی اسلامی تہذیب و تمدن سے شیفتگی اور ترک عوام میں اسلامی تعلیمات کے گہرے اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج وہاں مذہبی بیداری کے آثار صاف نظر آرہے ہیں اور احیائے اسلام کی کوششیں رنگ لا رہی ہیں۔

[23] Muhammad Nizam Oglo"Impact International" London(1997), Vol.27, June, P:17.